تصدیق
جلد۰۱ شمارہ۰۵، ۲۰۲۳

Article

NATIONALISM AND SHORT STORY OF ZAHIDA HINA "HUA PHIR SY HUKM SADIR"

قومیت پرستی اور زاہدہ حنا کا افسانہ "ہوا پھر سے حکم صادر": ایک مطالعہ

Dr.Aqlima Naz*[1], Dr.Ghulam Farida[2]

[1]Assistant Professor, Department of Urdu Zuban-O-Adab, Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi

[2] Assistant Professor, Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad

*Correspondence: aqlimanaz@fjwu.edu.pk

[1] ڈاکٹر اقلیمہ ناز، [2] ڈاکٹر غلام فریدہ

[1] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو زبان و ادب، فاطمہ جناح ویمن یونی ورسٹی، راولپنڈی، [2] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی، اسلام آباد

ABSTRACT:

The feeling that is found in the people of a nation regarding the unity of their language, religion, region, source of livelihood, and customs is what makes it unique from other nations. This feeling is called the concept of nationalism. Most of the short story writers try to describe this concept in their writings. Zahida Hina is one of them, she is a renowned Urdu short story writer, Novelist, Columnist, and poetess of the era. She has short stories books namely "Titliaan Dhondny Wali", "Rah ma Ajal hy", "Raqs Bismal Hy", and "Qaidi Saans Lyta hy". Her short story "Hua Phir sy Hukm Sadir" is included in "Raqs Bismal hy" and in this short story, Zahida Hina tried to describe the geographical and chronological distance between the people of the two countries after the migration. It has been described in such a way that the attitudes of mutual hatred and non-conformity between the people of the two countries have come to the fore. The spirit of nationalism takes a negative direction when the color of extremism prevails in it. In this research, it will be found how nationalism is described by a writer as a psychological disorder.

KEYWORDS: Nationalism, Zahida Hina, Short story, hatred, non-conformity, Feminism, Hua Phir Sy Hukm Sadir

eISSN: 2707-6229
pISSN: 2707-6210
DOI:https://doi.org/10.56276/tasdiq.v5i01.150
Received:16-05-2023
Accepted:09-07-2023
Online:10-07-2023

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

کسی قوم کے افراد میں اپنی زبان، مذہب، علاقے، ذریعہ معاش اور رسم و رواج کے اتحاد کے حوالے سے جو احساس پایا جاتا ہے وہی اسے دیگر اقوام سے منفرد بناتا ہے۔ اس حساس کو تصور قومیت کا نام دیا جاتا ہے اور اسی سے کسی قوم کی تہذیبی شناخت متشکل ہوتی ہے ۔ یہ تصور مثبت اور منفی دونوں حوالوں سے مروج ہے۔ مثبت انداز میں کسی قوم کے افراد اپنے قومی اتحاد کو قائم رکھنے کے لیے انہی انفرادی حوالوں کو بنیاد بناتے ہیں جبکہ منفی معنوں میں یہی انفرادی تشخص دیگر اقوام کے حوالے سے تخریبی سوچ کو رواج دیتا ہے اور قومیت پرستی کا موجب ٹھہرتا ہے۔ قومیت پرستی کا تصور زیادہ پرانا نہیں بلکہ اٹھارویں صدی کی پیداوار ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی تشکیل سے جب ایک گاؤں یا علاقے نے اپنی ضروریات سے زائد پیداوار بڑھائی تو اس کے نتیجے میں تجارتی منڈیاں وجود میں آئیں۔ بعد ازاں ان تجارتی سرگرمیوں کے نتیجے میں بننے والی برادریوں سے قومیت پرستی کے تصور نے جنم لیا۔ اس وقت اس تصور کی بنیاد ان پانچ عوامل پر تھی: مستقل اقامت (خانہ بدوش نہ ہوں)، مشترک زبان، علاقہ، ثقافت اور معیشت۔ ان خصائص پر مبنی برادریوں نے اپنے آپ کو قوم کہنا شروع کیا۔ یہی قومیں جب صاحبِ ثروت ہوئیں تو انھوں نے اس وقت کے جاگیر دارانہ نظام اور سرمایہ داری کے خلاف بغاوت کی، جس کے نتیجے میں قومی ریاستوں کا قیام عمل میں آیا۔

ادب میں جہاں قومی تشخص کے مثبت حوالے بیان ہوئے ہیں وہیں قومیت پرستی کے منفی تصور پر بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس ذیل میں فکشن کی تقریباً تمام اصناف میں اس تصور کی بازگشت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں جن افسانہ نگاروں کے ہاں اس تصور کو زیادہ جامعیت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے ان میں ایک اہم نام زاہدہ حنا کا ہے۔ زاہدہ حنا افسانہ نگار، شاعرہ اور کالم نویس ہیں، ان کی نگارشات عصری حسیت کی آئینہ دار ہیں۔ مصنفہ کا تعلق بنیادی طور پر پاکستان سے ہے تاہم ان کے افسانوں کے پلاٹ اور کردار بنگلہ دیش، افغانستان، ایران، سری لنکا، روس، امریکہ اور چلی سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ان کرداروں کی زبانی ان کی دلی کیفیات اور تاثرات کو بیان کرتی ہیں۔ اس حوالے سے وہ اپنی کتاب "قیدی سانس لیتا ہے" کے دیباچے میں لکھتی ہیں۔

> "جیسے سوئی کی ناک سے گوشت میں اتری ہوئی پھانس نکالی جاتی ہے اور پھر سکھ کا سانس لیا جاتا ہے۔ ویسے ہی میں نے اپنے ضمیر اور شعور میں چبھی ہوئی پھانسوں کو قلم کی نوک سے نکالا ہے اور ورق پر رکھ دیا ہے۔ اب اگر آپ کو یہ چبھنے لگیں تو اس میں میرا کوئی دوش نہیں۔"[1]

افسانہ نگار نے اپنے خطے کے تاریخی تناظرات کو خاص طور سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے، خاص طور سے برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کو انھوں نے بالکل مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔ تقسیم کا سانحہ محض دو ملکوں کی تقسیم سے عبارت نہیں ہے بلکہ یہ واقعہ دو مذاہب اور دو قوموں کے درمیان خلیج پیدا کرنے کا سبب بنا۔

> "بیسوی صدی کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ہجرت کی صدی ہے، پہلی عالمی جنگ، دوسری عالمی جنگ، تقسیمِ ہندوستان اور پھر بنگلہ دیش کی علاحدگی، یہ ایسے واقعات ہیں جنھوں نے اس خطے کے مکینوں کو بار بار ہجرت پر مجبور کیا۔ تقسیمِ ہندوستان میں جہاں لاکھوں لوگ ہجرت کے کرب کا

شکار ہوئے ان میں زاہدہ حنا اور اس کا خاندان بھی شامل ہے۔ان کو اپنے آبائی علاقے سے ہجرت کیے کئی دہائیاں بیت گئیں مگر ان کا دل اور روح آج بھی سہسرام کے علاقے سے محبت کرتے ہیں۔"۲

افسانہ "ہوا پھر سے حکم صادر" میں زاہدہ حنا نے ہجرت کے بعد دو ملکوں کے افراد کے درمیان پیدا ہونے والے زمینی اور زمانی فاصلوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں میں قومیت پرستی کے منفی جذبے کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ دونوں ممالک کے لوگوں میں موجود باہمی منافرت اور عدم موافقت کے رویے کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ قوم پرستی کا جذبہ اس وقت منفی سمت اختیار کرتا ہے جب اس میں شدت پسندی کا رنگ غالب آجائے۔ اس افسانے میں قومیت پرستی کو نفسیاتی عارضے کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ افسانے کا کردار عمران بنگالیوں سے اس لیے شدید نفرت کرتا ہے کیونکہ اس کے والد کی وفات کے بعد اس کی ماں نے ایک بنگالی سے شادی کرلی تھی۔ بظاہر اس کا اپنے باپ کے حوالے سے غصہ اور تلخی عام سی بات محسوس ہوتی ہے لیکن آگے چل کر زندگی میں وہ کبھی بھی بنگالیوں کے بارے میں مثبت رائے پیدا نہیں کر سکا۔ اسے بنگالی ناموں، ان کی جسامت، رنگ، حتی کہ ان کی پوری نسل سے ہی نفرت پیدا ہو چکی ہے۔

"عمران نے وہسکی سے بھرا ہوا گلاس دیوار پر دے مارا اور دھاڑا" دماغ خراب ہوا ہے تمہارا؟ یہ کالے ٹھگنے ہم پر حکومت کریں گے؟ ہم ان مردہ بنگالیوں کے لیے احتجاج کریں گے؟ جلوس نکالیں گے؟ انھیں چن چن کر قتل کر دینا چاہیے، کتے، نمک حرام۔ کھاتے پاکستان کا اور گاتے ہندوستان کا ہیں۔"۳

تقسیم سے پہلے یہی لوگ چند کوس کی دوری پر تھے لیکن اب سرحدوں کی تقسیم نے ان کے درمیان صدیوں کے فاصلے اور دوریاں پیدا کر دی ہیں۔ بعد ازاں سقوطِ ڈھاکہ نے صورتحال کی سنگینی میں مزید اضافہ کر دیا۔ ایسے میں ہر شخص اپنے خطے اور علاقے کے لوگوں کی حمایت کرتا نظر آتا ہے۔ اس چیز نے انسانیت سے زیادہ قومیت پرستی کے منفی رویوں کو ہوا دی۔ اپنے خطے اور سرزمین سے محبت ایک فطری جذبہ ہے، لیکن بعض اوقات یہ جذبہ اور تعلق اس حد تک شدت اختیار کر جاتا ہے کہ انسان باقی خطوں کو نفرت اور ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ نادرہ ایک بھارتی لڑکی پاکستانی لڑکے عمران سے شادی کر کے پاکستان آتی ہے تو اسے قدم قدم پر ایسے منفی رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کالج میں پڑھاتے ہوئے بھی اپنے ساتھی اساتذہ سے حوصلہ شکن جملے سننے کو ملتے ہیں۔

نفرت اور ناپسندیدگی کا یہ رجحان اس وقت زیادہ شدت اختیار کر جاتا ہے جب عمران نادرہ کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ وہ اسے بی بی سی ہندی سننے کی بجائے بی بی سی اردو سننے کو کہتا ہے۔ یہ نفرت جب مزید بڑھتی ہے تو فرد اپنی قوم کو مضبوط بنانے اور دوسری اقوام کو کمزور کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اس افسانے میں عمران کے دل میں اپنی قوم کو مضبوط بنانے سے زیادہ دوسری قوم کو کمزور کرنے کا ہے

قومیت پرستی کا رویہ دوسری قوموں کے خلاف جس منافرت کے جذبے کو جنم دیتا ہے وہ بجائے خود اذیت پسندانہ طرزِ عمل ہے۔ یہ اذیت ایک نارمل ذہن کے انسان کو بھی خود احتسابی کے بعد مجرم قرار دیتی ہے۔ نادرہ بظاہر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی ہے اور اس کی سوچیں صحت مندانہ طرزِ عمل کی عکاس ہیں، تاہم اپنی شادی کا فیصلہ اس کے لیے ساری زندگی کی اذیت کا باعث بن جاتا ہے۔ اس کے اندر اپنی مٹی اور اپنے لوگوں کی محبت کرب ناک صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ اس بات کا اظہار نادرہ کے اُس مکالمے سے ہوتا ہے جس میں وہ اپنی بہن کو اپنے داخلی جذبات کے بارے میں بتاتی ہے۔

"ہم دونوں کا خمیر ایک مٹی سے اٹھا ہے لیکن ہم دو علیحدہ کُروں پر رہتے ہیں۔ تم بابا جان کے پاس چھ ہزار میل کا سفر کر کے دو دن مین پہنچ جاؤ گی اور میں چند میل کی دوری پر ہونے کے باوجود جانے کب پہنچوں۔ میرے راستے میں میرے اپنے فیصلے کی اور جنگ کی پچھل پائی بیٹھی ہے۔ میرے لیے میرا آبائی شہر مریخ سے بھی پرے ہے، کہکشاؤں سے بھی دور ہے۔"۴

یہ منفی سوچیں جب انفرادی سطح سے نکل کر اجتماعی لاشعور کا حصہ بنتی ہیں تو خطرناک صورتحال اختیار کر لیتی ہیں۔ افسانے میں پاکستانی عوام خصوصاً تعلیم یافتہ طبقے کا رویہ ان کی اس نفرت کا عکاس ہے۔ تعلیم اور شعور کسی بھی قوم کی ذاتی میراث نہیں ہوا کرتی، اس لیے اس کو حاصل کرنے کے لیے کسی خاص ادارے یا ملک کا شناختی نشان ساتھ ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ افسانے میں نادرہ جب پاکستان کے تعلیمی اداروں میں پڑھانے کے لیے درخواست دیتی ہے تو جواہر لال یونیورسٹی کی ڈگری اسے ہر جگہ قابلِ اعتراض بنا دیتی ہے جبکہ دوسری طرف آکسفورڈ یونیورسٹی کی ڈگری اسے اداروں کی طرف سے سامنے آنے والے شدید ردعمل سے بچا لیتی ہے۔

"جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی ڈگری کی ان لوگوں کے لیے کوئی اہمیت نہ تھی لیکن آکسفورڈ کا معاملہ کچھ اور تھا۔۔۔۔

ہم ان بنگالیوں کو حکومت کیسے دے دیں؟ ایک پروفیسر نے اسٹاف روم میں چیخ کر کہا۔

لیکن ان بنگالیوں نے اگر پاکستان کے لیے ووٹ نہ دیے ہوتے تو بٹوارا نہیں ہو سکتا تھا۔ نادرا نے دھیمے لہجے میں انھیں یاد دلایا۔

ہاں بھئی تم تو انڈین ہو، یہی کہو گی۔ یہ ساری آگ لگائی ہوئی تمہارے انڈیا کی ہے۔"۵

افسانے کی مرکزی کردار اس قسم کی شدت پسندانہ سوچ سے ماورا خیالات کی مالک ہے۔ اس کے لیے بنیادی انسانی جذبے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستان اور پاکستان میں سرحدی حد بندیاں ہونے کے باوجود عمران کی محبت کو اہمیت دیتی ہے اور اس سے شادی کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ افسانے میں دو طرح کی ذہنی سطح کے کرداروں کا تقابل پیش کیا گیا ہے، ایک طرف افسانے کی مرکزی کردار ہے جو متوازن سوچ اور فکر کی مالک ہے اور دوسری طرف اس کا شوہر عمران ہے جو انتہائی متشدد ذہن کا مالک ہے۔ اس کے شدت پسندانہ رویے کے پس پردہ حقائق کو بھی افسانہ نگار نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ والدہ کا ایک بنگالی سے دوسری شادی کا فیصلہ اس کے بچپن کا ایک خوفناک سانحہ ہے۔ اس کردار کی منفی جذباتیت نے اس شادی کو بجائے مثبت انداز میں سمجھنے کے منفی رنگ میں ہی ہمیشہ سوچا

ہے۔اس کا دوسرا باپ ایک بہت مخلص انسان تھا، جس نے نہ صرف اس کے پورے گھرانے کو معاشی حوالے سے مدد فراہم کی بلکہ انھیں وہ تحفظ دینے کی بھی پوری کوشش کی جو ایک گھر کے سربراہ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ تاہم اس سارے خلوص اور اپنائیت کے باوجود عمران کے رویے کی تلخی اور غصے میں کبھی کمی واقع نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شادی کے بعد بھی بنگالیوں کے ساتھ اسی بغض اور عداوت کو روا رکھتا ہے جو اس نے اپنے لاشعور میں ان کے لیے پال رکھی ہے۔

> "وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ عمران کے دل میں بنگالیوں یا ہندوستانیوں کے لیے زہر ہلاہل ہے۔ پھر اس نے ایک ہندوستانی لڑکی سے شادی کیوں کی تھی۔"٦

یہاں افسانہ نگار نے عمران کے کردار کے ذریعے بحیثیت قوم ہماری سوچ کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے لوگ دو مختلف اقوام سے تعلق رکھنے کے باوجود صدیوں ایک ہی جگہ پر اکٹھے رہے ہیں۔ تاہم ان کے درمیان نفرت کی جس فضا کو تخلیق کیا گیا اُس نے ان کے درمیان سے انسانیت کے رشتے کو بھی ختم کر کے رکھ دیا۔ تقسیم کے بعد یہ منافرت اس حد تک شدت اختیار کر جاتی ہے کہ دونوں اقوام کے باسی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ ایسی نفرت انگیز فضا میں تعلیم اور شعور بھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھے لکھے اساتذہ بھی اس نفرت کو بھڑکانے کے ایجنٹس ثابت ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے مرزا حامد بیگ کہتے ہیں۔

> "زاہدہ حنا کے افسانوں میں وجودیت کے فلسفے کے زیر اثر ہمارے عہد کی مضطرب انسانی جدوجہد کی خاص معنویت ہے اور وجودی سطح پر عورت اور مرد کا ازلی تنازع توجہ کا طالب۔"٧

افسانے میں بھی اسی نفرت کا شکار افسانے کی مرکزی کردار یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ اگر اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ایسی قومیت پرستانہ سوچ کو ہوا دی جا رہی ہے تو پھر یہاں کے چھوٹے علاقوں میں بسنے والے ہندوؤں کے ساتھ مقامی لوگوں کی نفرت کا کیا عالم ہو گا۔

> "دسمبر آیا۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان لڑائی شروع ہوئی اور زندگی تلخ سے تلخ تر ہوتی گئی۔۔۔ گھر کی تمام کھڑکیوں پر اس نے سیاہ کاغذ چپکا دیے تھے۔ ہوائی حملے کا سائرن بجتا اور عمران کے زہریلے جملے شروع ہو جاتے "تم اپنے ہوائی جہازوں کو روشنی تو نہیں دکھا رہیں" وہ سر پکڑ کر سوچتی کہ نفرت کیا اس انتہا تک بھی جا سکتی ہے؟ کالج میں بھی اس کے ساتھ پڑھانے والیوں کا کچھ عجیب سا رویہ تھا۔ یہ سوال اس کے سامنے اکثر آ کھڑا ہوتا کہ یہ لوگ سندھ کے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں رہنے والے ہندوؤں کے ساتھ کیا کرتے ہوں گے۔"٨

یہ نفرت آمیز رویہ اس حد تک شدت اختیار کر جاتا ہے کہ بالآخر ایک نفسیاتی عارضے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ابتدائی سطح پر اس کردار کی منفیت، بنگالی قوم سے اُس کی شدید نفرت کی صورت میں سامنے آتی ہے تاہم بعد ازاں اس کے چیخنے چلانے اور لڑنے جھگڑنے کے رویے سے یہ کردار قابلِ ہمدردی ٹھہرتا ہے۔ وہ اپنے اس غلط رویے کی وجہ سے بالکل تنہا ہو چکا ہے، اس سے خون کے رشتے

بھی چھن چکے ہیں۔ وہ ذہنی طور پر اس حد تک بیمار ہو چکا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اذیت دینے کے لیے جان بوجھ کر تلخ باتیں کرتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف نادرہ کے کردار میں وہ استقامت اور مضبوطی نظر آتی ہے جو اس نظریاتی جنگ میں شروع سے آخر تک مضبوط اعصاب کے ساتھ کھڑی نظر آتی ہے۔

> " زاہدہ حنا ایک نظریاتی افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے برصغیر کے سیاسی بحران کو تہذیبی زوال کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ہاں وجودی احساسات بھی موجود ہیں لیکن انھوں نے وجودی فلسفے کو بے عملی کی سطح پر نہیں اپنایا۔ بلکہ ان کے کرداروں میں زندہ رہنے اور جدوجہد کرنے کا بے پناہ جذبہ موجود ہے۔ ان کے کردار بے بسی کے خلاف جہاد کرتے نظر آتے ہیں۔"۹

افسانے میں جس نفرت انگیزی کا اظہار کرداروں کے رویے سے ہوتا ہے وہ دراصل کسی بھی قوم کے اجتماعی لاشعور کی پیداوار ہے۔ جس طرح مثبت اور تعمیری رویے قوموں اور نسلوں کے اقداری نظام کا حصہ ہوتے ہیں اسی طرح نفرت اور شدت پسندی بھی قوموں کو تہذیبی ورثے کی صورت میں ودیعت ہوتی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار آکسفورڈ یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ ہے، اتنے بڑے تعلیمی ادارے سے تعلیم حاصل کرنے کے باوجود عمران سے جس وسیع القلبی اور متوازن فکری رویے کی امید تھی یہ کردار اس کے بالکل برعکس رویے کا اظہار کرتا ہے۔

> " اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ عمران کو بنگالیوں سے اتنی زہریلی نفرت کیوں تھی۔ وہ اتنا جاہل تھا کہ اس نے اپنی ماں کی مجبوری کو غداری فرض کیا تھا۔ نادرہ کی سمجھ میں سب کچھ آرہا تھا اور یہ بھی کہ آکسفورڈ کی تعلیم عمران کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔"۱۰

زاہدہ حنا کی اپنے عہد کی تاریخ اور سیاسی و سماجی حالات و واقعات پر گہری نظر ہے۔ وہ معاشرے میں پنپنے والی نفرت اور شدت پسندی، اور اس کی تباہ کاریوں کے انسانی زندگیوں پر اثرات کو نہ صرف موضوع بناتی ہیں بلکہ اس کے پس پردہ محرکات کا کھوج لگانے کی بھی سعی کرتی ہیں۔

> "زاہدہ حنا کی کہانیاں تاریخی، سماجی اور تہذیبی پس منظر سے جنم لیتی ہیں۔۔۔ زاہدہ حنا کا تاریخی، تہذیبی اور مذہبی شعور، مطالعے کی وسعت، عالمگیریت کا احساس اور فلسفہ و تصوف کی جھلکیاں جا بجا افسانوں میں نظر آتی ہیں۔"۱۱

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو افسانے میں زاہدہ حنا نے قومیت پرستی کے رویے کو جس تناظر میں بیان کیا ہے وہ تاریخی سے زیادہ نفسیاتی حوالوں سے زیادہ اہم ہے۔ کسی بھی عہد کے اجتماعی لاشعور میں اس عہد کے تاریخی، تہذیبی، معاشی و سیاسی اور نفسیاتی تمام حوالے برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔ تقسیم کے فوراً بعد کا منظر نامہ دیکھا جائے تو اس میں دونوں ممالک کے لوگوں کے درمیان بغض اور عداوت کے رویے شدت سے پروان چڑھ رہے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ زمینی حقائق ہیں، دونوں ممالک کی غیر منصفانہ جغرافیائی تقسیم، قتل و غارت گری اور اس سے بڑھ کر کشیدہ سیاسی فضا، ان سب حالات نے مل کر دونوں ممالک کے لوگوں کے درمیان منافرت اور عداوت کے رویوں

کو پروان چڑھایا۔ ایسی صورت حال میں تعلیم یافتہ اور باشعور لوگوں کے ہاں بھی دوسری اقوام کے حوالے سے شدت پسندانہ اور تلخ رائے کا اظہار ہو تا نظر آتا ہے۔ اس افسانے کی پوری فضا ایسی ہی صورت حال سے عبارت ہے جس میں اعلیٰ تعلیم اور مہذب لوگوں کے ساتھ رہنے کے باوجود عمران کی منفی جذباتیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ یوں یہ افسانہ قومیت پرستی کے اُن منفی رویوں کو بے نقاب کرتا ہے جو انسانوں کو انسانی ہمدردی سے زیادہ اُن کی قومیتوں کی بنیاد پر پرکھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ زاہدہ حنا، قیدی سانس لیتا ہے، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۳ء

۲۔ https://khayyalnama.com/book-shelf/، بتاریخ یکم فروری ۲۰۲۳ء، بوقت ۰۹:۰۲ صبح

۳۔ زاہدہ حنا، رقص بسمل ہے، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص ۲۵۰

۴۔ ایضاً، ص ۲۴۳

۵۔ ایضاً، ص ۲۴۸-۲۴۷

۶۔ ایضاً، ص ۲۵۱

۷۔ مرزا حامد بیگ، نسوانی آوازیں، سارنگ پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۲

۸۔ زاہدہ حنا، رقص بسمل ہے، ایضاً، ص ۲۵۲

۹۔ راحت افشاں، زاہدہ حنا روشن خیال افسانہ نگار، مشمولہ امتزاج، کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص ۱۲۶

۱۰۔ زاہدہ حنا، رقص بسمل ہے، ایضاً، ص ۲۵۴

۱۱۔ ڈاکٹر نورین رزاق، پاکستانی خواتین افسانہ نگار (اردو افسانے کی روایت کے تناظر میں) دستاویز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۳۸۵